تھے۔ مضامین پڑھنے والوں میں میں بھی تھا۔ میرے مضمون پر انہوں نے جی کھول کر داد دی۔ اسی حلقہ میں انہوں نے میرے افسانے کی ہندی کی چندی کی تھی۔ اسی حلقہ میں انہوں نے داد دے دے کر مجھے نہال کر دیا۔ پھر یہ سلسلہ آگے بھی چلا۔

تو اب حمید احمد خاں مجھ سے خوش تھے۔ پچھلے سارے گناہ معاف ہو چکے تھے۔ تو جب شہر میں موجود منتخب ماہرین غالب کو انہوں نے اپنے دفتر میں چائے پر مدعو کیا تھا تو ساتھ میں مجھے بھی یاد کر لیا۔ اس وقت خاں صاحب پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے عہدے پر فائز تھے۔ بھرے بیٹھے تھے۔ غالب کے سلسلہ میں حکومت سے اپنی خط و کتابت کا احوال سنایا۔ بتانے لگے کہ میں نے حکومت پاکستان کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ غالب کا صد سالہ جشن قومی سطح پر منانے کا اہتمام کیا جائے۔ وزارت تعلیم کی طرف سے استفسار کیا گیا کہ جس شاعر کے سلسلہ میں آپ نے یہ تجویز پیش کی ہے اس کے متعلق بتایا جائے کہ اس نے کتنا کام کیا ہے اور اس کی کتنی تصانیف ہیں۔ میں نے یہ فریضہ بھی ادا کر دیا۔ ادھر سے جواب آیا کہ اس شاعر کا اتنا کام تو نظر نہیں آتا کہ اس کا جشن قومی سطح پر منایا جائے۔

شہر میں غالب کی آبرو کا یہ احوال سنانے کے بعد کہا کہ میں نے سوچا ہے کہ یونیورسٹی کے محدود وسائل جس حد تک اجازت دیتے ہیں اس حد تک ہم ہی اس جشن کا اہتمام کریں۔ سو ایک مجلس یادگار غالب وجود میں آ گئی۔ طے ہوا کہ غالب کی ساری نظم و نثر نئے سرے سے مرتب کر کے اس موقع پر شائع کی جائے۔ محققوں کی طرف سے پیش کش ہوئی کہ یونیورسٹی کے محدود ذرائع کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ اس کام کا معاوضہ طلب نہیں کریں گے۔

لیجئے محقق حضرات اپنے کام میں جت گئے۔ اور عابدی صاحب گمشدہ مخطوطہ کی تلاش میں لاہور کے گلی محلوں کی خاک چھاننے لگے۔ منصوبے نے خوش اسلوبی سے مراحل طے کیے۔ تحقیق و ترتیب اور تدوین کے مرحلوں سے گزر کر منصوبہ کتابت اور طباعت کے مراحل میں داخل ہوا' مگر عین وقت پر کریال میں غلہ لگا۔ طباعت کے عین بیچ رنگ فلک بدلا۔ ملک میں ایوب خاں کے خلاف تحریک زور پکڑ گئی۔ یونیورسٹی ہنگاموں اور ہڑتالوں کی زد میں آ گئی۔ حمید احمد خاں حکومت کے معتوب ٹھہرے۔ پنجاب کے گورنر سابق جنرل موسیٰ خاں نے گورنری سے فراغت حاصل کرتے کرتے اپنی جرنیلی دکھائی اور خاں صاحب کو اچانک وائس چانسلری سے فارغ کر دیا۔ مجلس یادگار غالب یتیم ہو گئی۔ نئے وائس چانسلر علامہ علاء الدین صدیقی کے لیے تو وہ سوتیلی تھی۔ انہوں نے غالب کے طرف داروں کے استفسار پر کورا جواب دے دیا کہ یونیورسٹی کے حالات جشن غالب کے لیے سازگار نہیں۔ سو اس خیال سے منہ دھولو۔

اور اب مجلس کی آخری میٹنگ یاد آ رہی ہے۔ رجسٹرار صاحب زیب محفل تھے اور بتا رہے تھے کہ مجلس کی مرتبہ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ فرمانے لگے کہ اہل مجلس اپنا کام کر چکے ہیں باقی ہمارا کام ہے۔ ہم سوچیں گے کہ مرتبین و محققین کو ان کی ترتیب دی ہوئی کتاب

کی کتنی جلدی عطا کی جائیں۔

اراکین مجلس نے رجسٹرار صاحب کے تیور دیکھے اور سوچا کہ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی بھلی۔ اس وقت جو ملتا ہے وہ لے لو۔ سو مطبوعات غالب کا ایک ایک سیٹ بغل میں دابا اور باہر نکل آئے۔ مجلس یادگار غالب کا خاتمہ بالخیر ہوا۔ کیسا جشن غالب، کیسی غالب مطبوعات کی افتتاحی تقریب، یہ سارا نبار یونیورسٹی کے گودام میں پہنچا دیا گیا۔

◆◆◆

تاشقند سے پہلے، تاشقند کے بعد

''اگر افریقہ کے کسی کونے میں کسی حبشی پر کوئی ظلم ہوتا ہے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر آتی ہے۔'' یہ بات کسی بھلی گھڑی میں سارتر نے لکھی تھی اور ٹی ہاؤس کی میز پر اس وقت سارتر زیر بحث تھا۔ ہمارے بیچ بیٹھے ایک دوست نے ٹکڑا لگایا ''تو پھر کشمیر میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری سے سارتر کیسے بچ سکتا ہے؟''

دوسرے دوست نے اس سے شہ پائی اور بولا ''اگر پاکستان کے ادیب یوم الجزائر منا سکتے ہیں تو یوم کشمیر کیوں نہیں منا سکتے۔''

اور یہ 1965ء کے دن تھے۔ مئی کا بیچ تھا۔ موسم گرم ہو چلا تھا اور برصغیر کی فضا میں ایک درہمی تھی۔ اس فضا میں اس گفتگو نے اپنا اثر دکھایا۔ دوسرے تیسرے دن ہی ٹی ہاؤس کی بالائی منزل میں چند ادیب سر جوڑ کر بیٹھے۔ ان بزرگوں کا دھیان آیا' جنہوں نے یوم الجزائر میں سرگرمی دکھائی تھی۔ خیر فیض صاحب تو شہر ہی میں نہیں تھے۔ اب وہ کراچی جا بسے تھے۔ مولانا صلاح الدین احمد اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ سید امتیاز علی تاج کو یاد کیا گیا۔ وہ آن موجود ہوئے۔ ان کی سرکردگی میں ایک چھوٹی سی مشاورتی کمیٹی بن گئی جو بعد میں پھیلتی چلی گئی۔ نعیم طاہر نے جو ان دنوں آرٹ کونسل کے سیکرٹری تھے' پیشکش ہوئی کہ ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر آپ کیا کریں گے' اس کام کے لیے آرٹ کونسل حاضر ہے۔ آرٹ کونسل میں جو میٹنگ ہوئی' اس میں اعجاز حسین بٹالوی' تجمل حسین اور خالد حسن نے بھی شرکت کی اور اب تجمل حسین نے پیش کش کی کہ ٹی ہاؤس ہی کی بغل میں تھنکر زفورم کا دفتر ہے۔ وہ جگہ اس کام کے لیے حاضر ہے۔ بس پھر تھنکر زفورم کا دفتر ہی اس کمیٹی کا دفتر بن گیا۔

آرٹ کونسل کی میٹنگ کی تصویر اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس میں اعجاز بٹالوی' تجمل حسین' خالد حسن' سعید محمود اور انجم رومانی کے چہرے مجھے نمایاں نظر آ رہے ہیں۔ ایک چہرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تاج صاحب اور نعیم طاہر تو تھے ہی' مگر اس تصویر میں نظر آ رہے۔ شاید کئی ایک اور بھی تھے۔ وہ بھی کیمرے کی زد سے باہر رہے۔ اس کمیٹی نے آگے کیا کیا' اس کی کچھ تفصیل جو مجھے یاد نہیں تھی اپنے ایک کالم میں نظر آ رہی ہے جو 13 جون 1965ء کے مشرق میں شائع ہوا۔

''اور اس سے دو دن پہلے کچھ ادیب سر جوڑ کر بیٹھے۔ یہ کوئی بڑا اجتماع نہیں تھا' مگر ادیبوں کی نسل اور ہر مکتبہ فکر کے ایک ایک دو آدمی موجود تھے۔ یہاں ڈاکٹر سید عبداللہ اور سید امتیاز علی تاج تھے۔ میاں بشیر احمد کراچی جاتے جاتے یہاں زیر بحث آنے والی

تجویز کو اشیر واد دے گئے تھے۔ احمد ندیم قاسمی تھے۔ قتیل شفائی تھے۔ پھر ایک نسل ناصر کاظمی کی اور ایک نئی نسل افتخار جالب کی۔

''طے ہوا کہ لاہور کے ادیبوں' فنکاروں اور دانشوروں کو جمع کرو اور کشمیر کے نام پر افریقہ اور ایشیا کے ضمیر کو خطاب کرو۔ یورپ کے ضمیر کو پکارو۔ اور پاکستان کے دوسرے شہروں کے ادیبوں سے کہو کہ وہ بھی اکٹھے ہوں اور بے زبان کشمیر کی زبان بنیں۔

''ایک خط سارتر کو' ایک خط برٹرنڈ رسل کو' ایک اپیل بھارت کے ادیبوں سے' ایک محضر نامہ افریقہ اور ایشیا کے ادیبوں کی خدمت میں' اور ایک محضر نامہ الجزائر میں افریشیائی کانفرنس کرنے والوں کی خدمت میں۔''

مجھے دو خط یاد ہیں۔ ایک سارتر اور رسل کے نام' دوسرا کرشن چندر کے نام۔ اکیلے کرشن چند کے نام یہ سوچ کر کہ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ ایک کرشن چندر کو خطاب کیا۔ تو گویا ہندوستان کے سارے ادیبوں سے کلام ہو گیا۔ اس جلسے میں نہ نعرے لگے' نہ جذباتی تقریریں ہوئیں' معاملہ کی باتیں سنجیدگی کے ساتھ ہوئیں۔ مذکورہ خط پڑھ کر سنائے گئے۔ مگر ان خطوط کے ساتھ ہوا کیا۔ جلسہ تو بہت اہتمام سے ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی کا سینٹ ہال بھرا ہوا تھا۔ شہر کے کم و بیش سارے ہی ادیب اور دانشور اکٹھے تھے۔ صدارت کی کرسیوں پر تین شخصیتیں رونق افروز تھیں۔ سید امتیاز علی تاج' ڈاکٹر سید عبداللہ' احمد ندیم قاسمی' خطوں پر' محضر نامے پر سب نے دستخط کئے۔ سارے مراحل طے ہو گئے۔ مگر بعد میں جب ٹٹولا تو اصلیں غائب۔ ہاں میری حیثیت سیکرٹری کی تھی۔ میں نے بہت پوچھ گچھ کی۔ تھنکر زفورم کے دفتر والوں کو ٹٹولا۔ بھید نہ کھلا کہ ہوا کیا۔ اعجاز بٹالوی کے مشورے سے پھر یہی ٹھہری کہ نقلوں پر گزارہ کیا جائے اور جنہیں بھیجنا ہے وہی بذریعہ ڈاک روانہ کر دی جائیں۔

اس تجربے سے میں نے یہ جانا کہ جس کا کام اسی کو ساجھے۔ اگر ادیب جلسے جلوس کی دنیا میں قدم رکھتا ہے تو پھر اسے اس دنیا کے بھید بھاؤ کا پتا ہونا چاہیے۔ نہیں تو اپنی کھال میں رہے اور بس لکھنے لکھانے سے غرض رکھے۔ جو سوچا سمجھا ہے اس کا حق حساب قلم ہی سے کرے۔

اے لو' یہ تو فضا اور کشیدہ ہو گئی۔ اور پھر کشیدہ ہوتی ہی چلی گئی۔ ستمبر کے آتے آتے سچ مچ جنگ کے بادل سر پہ منڈلانے لگے۔ ہندوستان اور پاکستان کے بیچ تناتنی کب نہیں ہوئی تھی' مگر ہر بار یہی ہوا کہ کچھ ادھر سے دھمکیاں کچھ ادھر سے۔ ادھر سے بندوقیں سیدھی ہو گئیں۔ ادھر سے مکا دکھایا گیا۔ سر سے پانی اونچا ہونے لگتا تو تھوڑی عقل آ جاتی اور بیچ بچاؤ ہو جاتا۔ مجھ جیسے سادہ دل سمجھ رہے تھے کہ اب کے بھی ایسا ہی ہو گا' مگر اب کے تو پانی واقعی سر سے اونچا ہو گیا۔

وہ 6 ستمبر کی صبح تھی۔ روز کی طرح چڑھی تھی۔ روز کی طرح میں گھر سے نکلا۔ آرام سے دفتر پہنچا' مگر اندر قدم رکھا اور ادھر ایسی بجلی

کڑکی کہ دفتر کے در و دیوار ہل گئے۔ یا اللہ یہ کون سی قیامت آئی۔ بس فوراً ہی کریڈ پہ خبر آئی کہ جنگ شروع ہوگئی۔ ہندوستان کی فوجیں لاہور شہر کے در پہ دستک دے رہی ہیں۔ یا الٰہی خیر۔ اخبار کا دفتر ویسے ہی حساس ہوتا ہے' کھلبلی مچ گئی۔ ٹیلی فون کھڑکھڑانے لگے۔ کریڈ کی مشین تیز تیز چلنے لگی۔

مجھے دفتر میں اپنا مصرف نظر نہ آیا تو نکل کھڑا ہوا کہ باہر چل کر دیکھیں کہ کیا احوال ہے۔ سیدھا ٹی ہاؤس پہنچا۔ ٹی ہاؤس خالی پڑا تھا یا یہ بجلی سی جو کڑکی تھی اس کی دہشت سے خالی ہوگیا۔ ہاں بجلی کی یہ کڑک پاکستان کے اس جنگی جہاز کا کرشمہ تھا جو ساؤنڈ بیریئر توڑ کر میدان جنگ کی طرف لپکا تھا۔

میں ٹی ہاؤس کے باہر کھڑا سراسیمہ مخلوق کو دیکھ رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اپنے شیخ صلاح الدین دفتر سے نکل سائیکل پہ دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ کتنے برسوں بعد مجھے آج کی تاریخی صبح شیخ صاحب کی صورت دکھائی دی تھی۔ میں نے پکار کر کہا کہ ''شیخ صاحب' جنگ شروع ہو چکی ہے' آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

سائیکل کو آہستہ کیا' کہا کہ ''گھر جا رہا ہوں۔''

میں نے کہا کہ ''شیخ صاحب' آپ کمال کرتے ہیں' آپ ایسے وقت میں گھر جا رہے ہیں۔''

شیخ صاحب سائیکل سے اترے۔ قریب آئے ''پھر کیا کریں؟''

میں نے کہا کہ ایسا کیجئے کہ سائیکل یہاں ٹی ہاؤس کے سٹینڈ پر کھڑی کیجئے۔ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھئے' چل کے ناصر کو ریڈیو سے نکالتے ہیں۔ پھر کہیں بیٹھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ کیا ہوا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔''

شیخ صاحب نے یہی کیا۔ لو آج ہم بھلا ریڈیو سٹیشن کے اندر قدم رکھ سکتے تھے۔ گیٹ بند تھا۔ مسلح پہریدار مستعد کھڑے تھے۔ اب کیا کریں۔ میں نے گیٹ کے برابر بیٹھے پنواڑی سے پوچھا کہ ناصر صاحب کا پھیرا ہوگیا۔''

''نہیں جی ابھی پھیرا نہیں ہوا۔ ان کا وقت ہوگیا ہے۔ آتے ہی ہوں گے۔''

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ اسی آن ناصر اندر سے نمودار ہوا۔ میں نے کہا کہ ''ریڈیو میں بیٹھے کیا کر رہے ہو' نکلو شیخ صاحب گاڑی میں بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔

''مگر آج تو ریڈیو میں بہت کام ہے۔''

''ہاں آج تو بہت کام ہونا چاہیے' مگر تم اس کام میں کیا ہاتھ بٹاؤ گے۔''

سوچ کر بولا۔ ''اچھا ابھی آتا ہوں۔''

ناصر گیا اور آیا۔ پھر ہم نے چل کر اپنے پرانے اڈے لارڈز میں جا کر چھاؤنی چھائی۔ ادھر چائے کے آتے آتے شیخ صاحب نے جانے کیا پینترا بدلا کہ جنگ کے ذکر سے فلسفہ کی بحث پر آ گئے۔ کمال سادگی سے وقت کے فلسفہ کی بحث کو وہیں سے پکڑا جہاں انہوں نے اب سے کئی برس پہلے سویرا کے دفتر میں اگلے دن کے لیے ملتوی کیا تھا اور جاری ہو گئے۔ میں بھی آج کتنے برس کے بعد ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ سو میں تازہ دم تھا۔ یکسو ہو بیٹھا۔ بیچ بیچ میں ہمارا کوئی شناسا بیرا آ کر تھوڑی کھنڈت ڈالتا۔ بتاتا کہ سائرن ہو گیا ہے۔ ہوائی حملہ ہونے والا ہے۔ شیخ صاحب طوعاً و کرہاً دم بھر کے لیے چپ ہوتے۔ ادھر وہ رخصت ہوا اور ادھر یہ پھر جاری۔ چائے پی' کھانا کھایا' پھر شور پڑا کہ ایوب خاں کی تقریر ہونے لگی ہے۔ شیخ صاحب ایوب خاں کے یوں بھی بہت قائل تھے اور اس وقت تو ہم سب ہی منتظر تھے کہ دیکھیں کہ جنرل اس نازک گھڑی میں کیا اعلان کرتا ہے۔ سو سب کی طرح ہم تینوں نے بھی یہ تاریخی تقریر پوری توجہ سے سنی۔ میں سمجھا کہ شیخ صاحب بس اب تھم گئے ہیں۔ مگر انہوں نے تقریر پہ مختصر سا تبصرہ کیا۔ یعنی اپنے اطمینان کا اظہار کیا اور پھر اپنے موضوع پر آ گئے۔

شام ہوتے ہوتے بیرے نے لپک جھپک بل پیش کیا۔ کہا کہ ''جلدی کرو جی' آج بلیک آؤٹ ہے۔ ہوٹل بند ہونے لگا ہے۔''

میں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''شیخ صاحب میری گاڑی بہت بے اعتباری ہے۔ رستے میں رک کر کھڑی ہو گئی تو میں کیا کروں گا۔''

''نہیں کھڑی ہو گی۔'' شیخ صاحب نے پہنچے ہوئے فقیروں والی شان سے کہا۔

خیر میں نے پہلے شیخ صاحب کو ٹی ہاؤس پہ چھوڑا۔ پھر ناصر کو ٹولنٹن کے نکڑ پہ۔ وہاں سے پلٹا۔ اب اندھیرا ہو چلا تھا اور اعلان ہو رہا تھا کہ کوئی گاڑی والا لائٹ نہ جلائے۔ کوئی لائٹ جلاتا تو پولیس والے بعد میں ٹوکتے' پہلے دائیں بائیں آگے پیچھے تیز تیز چلنے والے لعنت ملامت کرتے۔ شور مچاتے کہ ''کیا ہمیں مروانا ہے۔''

دوسرے دن کی سنو۔ دفتر میں قدم رکھا تو پتا چلا کہ جنگ کا فوری اثر یہ ہوا ہے کہ کاغذ کمیاب ہے۔ سو اب اخبار کے صفحات کم ہو گئے ہیں۔ ادھر جنگ کی خبروں کا وفور ہیں سو ''لاہور نامہ'' کے لیے فی الحال صفحوں میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

''گویا اب اخبار میں میرا کوئی کام نہیں ہے۔''

''کام کیسے نہیں ہے۔'' ہمارے منیجنگ اڈیٹر عنایت اللہ بولے ''جنگ میں لکھنا بعد میں ہوتا ہے پہلے تو دیکھنا اور مشاہدہ کرنا ہوتا ہے۔ تو دفتر سے نکلو۔ گھومو پھرو دیکھو کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ دو بیبیاں تمہارے سپرد ہیں۔ انہیں بھی ساتھ لے جاؤ۔ یہ بھی تو دیکھیں

کہ یہ شہر جنگ کو کیسے بھگت رہا ہے۔"

یہ دو بیبیاں تھیں، مسرت جبیں اور فریدہ حفیظ۔ ہاں مجھے یہ بھی تو بتانا چاہیے کہ "مشرق" کی معرفت عورت کو پہلی مرتبہ اردو صحافت میں داخلہ ملا تھا اور بڑی دھوم کے ساتھ داخلہ ملا تھا۔ مسرت جبیں کا کالم تھا تو عورتوں کے لیے مگر مردوں کی دنیا میں سوپر ہٹ جا رہا تھا۔ ویسے عورتیں پہلے تو اخبار واجبی واجبی پڑھتی تھیں۔ "مشرق" گھریلو عورتوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے کالجوں میں بھی بے تحاشا مقبول تھا۔ اس کے مختلف فیچروں اور کالموں کو دیکھتے دیکھتے قبول عام کی سند مل گئی۔ ریاض بٹالوی نے اپنے فیچروں میں ایک نیا طور نکالا تھا۔ بھیس بدل کر مختلف اداروں میں پہنچتے، کبھی مریض بن کر ہسپتال میں، کبھی ملزم بن کر تھانے میں اور ان اداروں کا کچا چٹھا فیچر میں پیش کرتے۔ ایک مرتبہ یہ حضرت اپنی دانست میں گم ہو گئے۔ مشرق میں اعلان ہو گیا کہ جو ان کا پتا لگائے گا انعام پائے گا۔ ادھر سینٹ ہال میں یوم محمد حسین آزاد منایا جا رہا تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد تقریر کر رہے تھے۔ انہیں اس جلسہ میں نبیرہ آزاد محمد باقر کی کمی محسوس ہو رہی تھی جو ابھی پچھلے دنوں اللہ کو پیارے ہوئے تھے۔ کہنے لگے "یہاں ایک شخص نظر نہیں آ رہا ہے۔ وہ آج ہمارے بیچ میں سے گم ہے۔"

اخلاق احمد دہلوی کی بغل میں بیٹھا ہوا ان کا ننھا صاحبزادہ برجستہ بولا "ریاض بٹالوی۔" اور محفل زعفران زار بن گئی۔

ہاں تو ایک تھیں مسرت جبیں اور دوسری فریدہ حفیظ جو انہی دنوں پنجاب یونیورسٹی سے نکل کر مشرق میں پہنچی تھیں۔ مجھے ویسے بھی اپنے کالم کے واسطے سے شہر میں خاک پھانکنے کا چسکا لگ چکا تھا۔ جنگ اس پر مستزاد۔ پھر اس وقت ساتھی بھی اچھے مل گئے تھے۔ بس فوراً ہی انہیں ساتھ لے کر میں نکل کھڑا ہوا، مگر سر منڈاتے ہی اولے پڑے اور پھر پڑتے ہی چلے گئے۔ تھوڑا چلے اور ہوائی حملے کا سائرن بجنے لگا۔ پھر چار قدم چلے اور پھر سائرن۔ اس عمل میں یہ ہی طے کرنا بھول گئے کہ جانا کدھر ہے۔

"ارے انتظار صاحب، ہم جا کہاں رہے ہیں؟"

"جہاں اللہ لے جائے گا۔"

"ایسا کرو کہ ماڈل ٹاؤن چلتے ہیں۔" یہ مسرت جبیں کی تجویز تھی۔ ماڈل ٹاؤن میں فرہاد زیدی رہتے تھے۔ ان کے اور مسرت جبیں کے بیچ تعلق خاص تھا۔ میں نے اس تعلق کے احترام میں فوراً ہی گاڑی کا رخ موڑا اور ماڈل ٹاؤن کی راہ پر پڑ لیے۔ اس راہ میں کچھ زیادہ ہی سائرن بجے اور یہ کہ اس سڑک پر دو طرف خندقیں بھی کل اور آج میں کھد گئی تھیں۔ پولیس والے ہدایت کرتے کہ فوراً خندق میں اتر جاؤ۔ ایک خندق میں بیٹھے بیٹھے مسرت جبیں پر عجب کیفیت طاری ہوئی کہ اس نے سسکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔ ہم

دونوں حیران۔

''ارے یہ تمہیں کیا ہوا۔ بمباری کے خوف سے رو رہی ہو۔''

''اصل میں مجھے اپنے ابو یاد آ رہے ہیں۔ پتا نہیں اس وقت وہ کس حال میں ہوں گے۔''

''مگر ہم تو دفتر میں جا کر یہی بتائیں گے کہ تم بمباری کے خوف سے رونے لگی تھیں۔''

اس بی بی نے اس بدنامی کے خوف سے فوراً ہی آنسو پونچھ لیے۔

خیر تو ماڈل ٹاؤن گئے۔ فرہاد زیدی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ انہیں ساتھ لیا۔ پلٹ کے دفتر آئے۔ ابھی سانس ہی لیا تھا کہ پاکستان کونسل سے طلبی کا فون آ گیا۔ نصیر انور بول رہے تھے' مگر پہلے صفدر میر کا ایک بیان سن لیجئے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ ''تصورات'' میرے سامنے ہے۔ ایک انٹرویو میں بیان دیتے ہیں۔

''لاہور میں ایک بڑا ادبی جلسہ 6 ستمبر 1965ء کو ہو رہا تھا۔ پنجابی مجلس نے بلھے شاہ کی شاعری پر تقریب کی۔ میں صدارت کر رہا تھا۔ تین سو ادیبوں نے شرکت کی۔ انتظار حسین بھی تھا۔ نئی صورت حال میں بلھے شاہ کی شاعری کے بجائے پاک بھارت کی ممکنہ جنگ پر گفتگو ہوئی۔''

غلط۔ ممکنہ کیا' جنگ تو شروع ہو چکی تھی۔ 6 ستمبر کو ایسا کوئی جلسہ نہیں ہوا۔ ہاں اب سنئے کہ ہوا کیا تھا۔ یہ اصل میں 7 ستمبر کی بات ہے۔ تو نصیر انور فون پر بول رہے تھے۔ کہہ رہے تھے'' یار ویسے تو آج بلھے شاہ کے سلسلہ میں تقریب ہونی تھی' مگر جنگ سے سارے پروگرام ہی بدل گئے۔ اب اس جلسہ کا پروگرام یہ ہے کہ جنگ کے ہنگام ادیبوں کو کیا کرنا چاہیے۔ اس پر گفتگو ہو۔ مگر ہوائی حملہ کا سائرن بار بار بج رہا ہے۔ شہر میں افراتفری ہے۔ ادیب ہاتھ نہیں آ رہے۔ جو دور ہیں وہ تو پہنچ ہی نہیں سکیں گے۔ تم تو قریب ہو۔ تم آ سکتے ہو۔

''بھائی میں تو دور بھی ہوتا تو آ جاتا۔ میں تو صبح سے حرکت میں ہوں۔''

''اگر صفدر میر صدارت کرے اور تم سے بولنے کو کہا جائے تو تمہیں اعتراض تو نہیں ہوگا۔''

''بالکل نہیں۔'' اور لیجئے جنگ کے صدقے ایک دوسرا روٹھا ہوا دوست من گیا۔

اس جلسہ میں گنتی کے لوگ تھے۔ یہی شفقت تنویر مرزا' راجہ رسالو اور چند ایک اور۔ ادیب اصل میں اگلے جلسہ میں جمع ہوئے جو 9 ستمبر کو منعقد ہوا تھا۔ ہال بھرا ہوا تھا۔ گنتی میں نہیں بتا سکتا۔ یہ جلسہ ہنگامہ خیز تھا۔ بہت ہنگامہ اس وقت ہوا جب صفدر میر نے یہ

تجویز پیش کی کہ ایک قرارداد ایوب خاں پر اظہار اعتماد کی منظور کی جائے۔ ایسی قرارداد منظور نہیں ہو سکی۔ اصل میں صفدر میر ایوب خاں کے پہلے ہی بہت مداح چلے آ رہے تھے۔ جنگی حالات میں یہ مداحی دو آتشہ ہو گئی۔ اسی ہنگام انہوں نے جو پہلی جنگی نظم لکھی اس میں بھی اس کا عکس آ گیا

''صدر ایوب کی آنکھ میں خون اتر آیا ہے''

اصل میں تو خون صفدر میر کی آنکھوں میں اترا ہوا تھا۔ اس کی نکاسی شاعری کے واسطے سے ہوئی۔ کس تیزی سے اترا اور کس تیزی سے اس کی نکاسی ہوئی۔ جنگ چھڑنے کے بعد جو پہلا اتوار آیا اور حلقہ کا جلسہ ہوا اس میں صفدر میر پہنچے اور اپنی پہلی جنگی نظم ''لاہور کو سلام'' پیش کی۔ اگلی اتوار تک دوسری نظم تیار تھی۔ ''سیالکوٹ کی فصیل'' اور یہ دونوں طویل نظمیں تھیں اور ایسی نظمیں جو خالی جنگی نعرہ نہیں تھیں، شاعری کی مثالیں بھی تھیں۔ اور ان نظموں کے واسطے سے صفدر کا ایک دیرینہ خواب بھی پورا ہو گیا۔ کب سے یہ عزیز یہ تمنا پال رہا تھا کہ اپنی شاعری کے واسطے سے عوام تک پہنچے۔ اپنی انقلابی نظموں کے واسطے سے تو یہ تمنا پوری نہیں ہوئی۔ اب ان نظموں کے واسطے سے پوری ہو گئی۔ نسبت روڈ سے ایک جلوس گزر رہا تھا۔ لاؤڈ سپیکر پر صفدر میر کی آواز گونج رہی تھی۔ میں نے دفتر میں بیٹھے بیٹھے ہی آواز سنی اور لپک کر باہر گیا۔ جلوس کے بیچ ایک ٹرک چل رہا تھا۔ صفدر میر ٹرک پر کھڑا گرج رہا تھا۔

''چلو واہگے کی سرحد پر
وطن پر وقت آیا ہے
وطن پر کٹ کے مر جانے کا یارو وقت آیا ہے''

صفدر کی شاعری کی ہانڈی میں زبردست ابال آیا تھا۔ جنگ کے پہلے ہفتے میں ایک نظم، دوسرے ہفتے میں دوسری نظم۔ اور دونوں جنگی کارناموں کی ٹکر پر شعری کارنامے، مگر پھر جنگ ہی تھم گئی۔ جتنی اس جنگ کی عمر تھی اتنی ہی اس شعری ابال کی عمر نکلی۔

پہلے سیز فائر، پھر اعلان تاشقند۔ صفدر میر کا پھر ایک بیان ''پھر معاہدہ تاشقند کے بعد بھی مسئلہ ہوا۔ اس کی مذمت کے لیے نیا عہد نامہ لکھا گیا۔ وہاں موجود سب ادیبوں نے دستخط کیے۔ انتظار حسین اور جیلانی کامران نے بھی کیے۔ دونوں ٹی ہاؤس میں آئے۔ گھبرا گئے اور اپنا نام کٹوا دیا۔''

پھر غلط۔ میں نے تو کسی ایسے بیان پر دستخط ہی نہیں کیے تھے۔ انکار کر دیا تھا۔ پھر نام کٹوانے کا سوال کہاں سے پیدا ہو گیا۔ ویسے یہ کون سا جلسہ ہے۔ کہاں ہوا تھا۔ اس میں خیر سے کتنے ادیب جمع ہوئے تھے۔ صفدر کی یادداشت بہت گھپلے کرتی ہے۔ اب

میں کہاں تک اس عزیز کی تصحیح کروں۔

ویسے ہمارے ادب میں اعلان تاشقند کے بعد کا زمانہ اخباری بیانات کا زمانہ ہے۔ شاعروں نے غزلیں کم لکھیں' بیانات پر دستخط زیادہ کیے اور افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کے حوالے سے کم اور اپنے بیانات کے ذریعے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ اس زمانے میں شہرت عام اور بقائے دوام کا یہ نسخہ نیا نیا دریافت ہوا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اخباری بیان کی یہ صنف پروان چڑھی اور شعر اور افسانے پر اس نے برتری حاصل کر لی۔ لگتا تھا کہ یہ زمانہ اعلان تاشقند ہی کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ جنگ ستمبر کے ہنگام ہم اپنی فوجی طاقت کے کچھ اس طرح قائل ہوئے تھے کہ اعلان تاشقند دشمن کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کا عمل نظر آتا تھا۔ بس اس کے ساتھ ہی ایوب خاں کا رعاب شعاب ختم ہو گیا۔ آمریت میں یہی ہوتا ہے کہ جب تک دبدبہ ہے آدمی دم نہیں مار سکتا۔ دبدبہ گیا تو پھر زبانیں ایسی کھلتی ہیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ تو اب ایوب آمریت ''غازی صدر ایوب کی آنکھ میں خون اتر آیا ہے'' والے پرشکوہ دور سے گزر کر ''ایوب کتا ہائے ہائے'' والے دور میں داخل ہو گئی تھی۔ شیر اب بکری نظر آ رہا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو وزارت سے مستعفی ہو کر سیاست کے میدان میں کود پڑے تھے اور اعلان تاشقند کے راز سے پردہ اٹھانے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ ویسے تو سب ہی سیاسی جماعتوں نے حسب توفیق تاشقند سے شہہ پائی اور طاقت پکڑی' مگر سچی بات ہے کہ اس کا سب سے کامیاب استعمال بھٹو صاحب نے کیا۔ یوں ان کی بارہ مسالوں والی سیاست میں ہر مسالے کا اپنا ذائقہ تھا۔ اسلام' سوشلزم' جمہوریت' مگر غالباً سب سے چٹ پٹا مسالہ یہی تھا۔ ان کا ہر جلسہ اس دھمکی پر ختم ہوتا تھا کہ اگلے جلسہ میں اعلان تاشقند کے پیچھے جو سازش ہے اس سے پردہ اٹھاؤں گا اور ہر جلسہ کے اعلان پر ادیبوں کا ٹولہ ٹی ہاؤس سے یہ توقع باندھ کر جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہوتا تھا کہ آج راز سے پردہ اٹھے گا' مگر پردہ نہ اب اٹھتا ہے نہ تب اٹھتا ہے۔

اس عمل میں جلسے جلوس تیزی پکڑتے چلے گئے' نعروں نے زور باندھا اور اس کے ساتھ ہی نظریاتی تقسیم ہوتی چلی گئی۔ اسلامی سوشلزم کی اصطلاح میں ایک نئی توانائی پیدا ہوئی۔ نئے پرانے اشتراکیوں نے سوچا کہ اسلامی مملکت میں رہنا ہے تو پھر اسلام تو ہو گا' تو چلو اشتراکیت کی خاطر تھوڑا اسلام بھی سہی۔ بھلے مسلمانوں نے سوچا کہ خالص اشتراکیت تو تیز دارو تھی۔ اسلام سے اس کا کچھ دف مر جائے گا' کچھ اس کی کڑواہٹ جاتی رہے گی۔ شاید اب یہ دارو مفید رہے گی' تو مختلف گروہوں نے اس نعرے کو مفید جانا اور وہ قبولیت کا درجہ حاصل کرتا چلا گیا' مگر اسلامی جماعت ایسی اڑن گھائیوں میں آنے والی نہیں تھی۔ ان کا موقف تھا کہ اسلام ہو تو خالص ہو۔ بس اس عمل میں ایک نئی اصطلاح ''اسلام پسند'' کی وجود میں آئی۔ تو اسلام پسند ایک طرف' سوشلسٹ دوسری طرف۔ اسلام

پسندوں کے لیے تو سوشلسٹ بھی سوشلسٹ تھے اور اسلامی سوشلسٹ بھی سوشلسٹ ہی تھے۔

بھٹو صاحب کی کرشمہ ساز شخصیت نے ادیبوں' دانشوروں کو لوٹ لیا۔ سوا ایسے ادیب بھی جنہوں نے سوشلزم سے کبھی کوئی واسطہ نہیں رکھا تھا اب اسلامی سوشلزم کا دم بھرتے نظر آ رہے تھے۔ لیکن ادیب اپنی تربیت سے مجبور تھے۔ جلسوں میں جا کر نعرے نہیں لگا سکتے تھے۔ اخباری بیان جلوسوں کی نعرہ بازی کا انہیں بدل نظر آیا۔ بس پھر یہ صنف دنیائے ادب میں فروغ پاتی چلی گئی۔ ہر دوسری تیسری شام کوئی رضا کار دانشور ایک کاغذ اور پنسل لیے ٹی ہاؤس میں نمودار ہوتا۔ ہر میز پر جاتا' وہاں بیٹھے ادیبوں سے تقاضا کرتا کہ بیان پہ دستخط کرو۔ متفق الخیال ادیب جوش ایمانی میں دستخط کرتے' باقی ادیب رعب میں آ کر بے پڑھے کہ کیا بیان ہے دستخط کرتے۔ ادھر میں نے قسم کھا رکھی تھی کہ کسی بیان پہ دستخط نہیں کرنا۔ یاروں کی نظر عنایت سے رجعت پسند تو میں پہلے سے چلا آتا تھا' اب میری رجعت پسندی لاعلاج ہوتی چلی گئی۔ نذیر ناجی نے مساوات میں کالم لکھ لکھ کر میری رجعت پسندی کو اور عالم آشکارا کر دیا۔

بیانات کی اس ریل پیل میں ایک بیان خاص طور پر مجھے یاد آ رہا ہے جو کراچی سے ترپین دانشوروں کی طرف سے جاری ہوا اور لاہور تک پہنچتے پہنچتے کتنے بیانات کو جنم دیتا چلا گیا۔ اس کا تعلق مولانا بھاشانی کی ذات سے تھا۔ مگر اس سے پہلے مجھے ایک اور واقعہ کا بھی تو ذکر کرنا چاہیے۔ اس ہنگامہ دار و گیر میں سوشلسٹ دو فرقوں میں بٹ چکے تھے۔ ترمیم پسند اور انقلابی۔ اور پلہ اس وقت انقلابیوں کا بھاری تھا۔ ترمیم پسندوں کا سلسلہ نسب تو سوویت روس سے ملتا تھا۔ سوویت روس پاکستان میں پہلے ہی کون سا نیک نام تھا۔ اب اعلان تاشقند کے وقت سے مزید رسوا ہو چکا تھا۔ پھر ایشین سکیورٹی پلان اور پاک ہند کنفیڈریشن کے شوشے بھی اسی سے منسوب تھے۔ سو ترمیم پسند سوشلزم تو ہمیں وارا نہیں کھاتا تھا۔ سو یہ گروہ سکڑتا چلا جا رہا تھا اور سید سبط حسن پرانے وقتوں کی یادگار نظر آتے تھے۔ اب انقلابیوں کی ایک نئی نسل پیدا ہو چکی تھی جنہیں سجاد ظہیر سے لے کر حمید اختر تک سب ترقی پسند موقع پرست اور انقلاب دشمن نظر آتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چینی برانڈ سوشلزم کا علم تھا۔ اسے وہ سچا اور کھرا سوشلزم جانتے تھے۔ نخالص انقلاب۔ پچھلے ترقی پسندوں کو تو اپنے نظریے کے اعلان اور تبلیغ میں بہت دشواریاں پیش آئی تھیں۔ غدار' اسلام دشمن لادین' روسی ایجنٹ' کیسے کیسے خطابات سے نوازے گئے' مگر نو ترقی پسندوں کو چین سے رشتہ داری کے باعث بہت سہولت حاصل تھی۔ چین ہمارا دوست اور ہندوستان کا دشمن۔ سو اس کا لادین انقلاب بھی ہمیں بھلا نظر آتا تھا۔ بلکہ نیک دل مسلمان چین کا دورہ کر کے واپس آتے تھے تو اہل وطن کو خوشخبری سناتے تھے کہ ہم چین میں اسلام کا جلوہ دیکھ کر آئے ہیں۔ مغرب کی بے حیائی سے پریشان مسلمان چین سے یہ ایمان افروز اطلاع لے کر آتے کہ عورت وہاں عورت نظر نہیں آتی۔ ایک جلسہ میں چین کے ایک نیک دل زائر سے جو اس

مشاہدے سے مسحور نظر آرہا تھا' میں نے تقریر کے بعد پوچھا کہ ''عورت اگر چین میں عورت نظر نہیں آتی تو پھر کیا نظر آتی ہے؟''

''جیسے اور سب نظر آتے ہیں۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ عورت ہے۔''

اور سب یعنی مرد۔ اور میں حیران کہ یا اللہ' کیا یہ اسلام کا تقاضا ہے کہ عورت اپنی صنفی شناخت کو گم کردے۔

اس پس منظر میں نوترقی پسندوں کو اپنی دعوت انقلاب میں بہت سہولت حاصل ہوگئی تھی۔ آخر وہ بھی تو ایک ثقافتی انقلاب برپا کرنے کے درپے نظر آرہے تھے۔ ان کا پہلا ہدف حلقہ ارباب ذوق تھا۔ ان کا خیال تھا کہ حلقہ اگر مشرف بہ انقلاب ہوجائے تو پھر پاکستان میں انقلاب کا رستہ کون روک سکتا ہے۔

اور اب مولانا بھاشانی کی طرف آیئے۔ شیخ مجیب الرحمٰن تو ہمارے لیے یکسر ناقابل قبول تھے۔ ایک تو وہ بھٹو صاحب کے حریف تھے۔ پھر ان کے چھ نکات نے انہیں بہت رسوا کر رکھا تھا۔ مولانا بھاشانی مولانا بھی تھے اور انقلابی بھی تھے۔ ان کا سکہ مغربی پاکستان میں چل گیا' مگر اسلام پسندوں نے ان کو مولانا نہیں مانا۔ بس انقلابی جانا اور ان کی جان کے دشمن ہوگئے۔ اسی چکر میں یہیں کہیں ان پر حملہ ہوگیا۔ باقی حلقوں میں اس واقعہ کی جو مذمت ہوئی وہ تو ہوئی' مگر ادیبوں اور دانشوروں نے بھی اس واقعہ پر بڑی شدت سے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔

اب میں اپنے اس وقت کے ایک کالم کی مدد سے یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ اس ردعمل نے لاہور کے ادبی حلقوں میں کیا شکل اختیار کی۔ تیس ادیبوں اور دانشوروں نے حملہ کی مذمت میں ایک بیان جاری کیا۔ اس کے جواب میں دوسری طرف سے چھبیس ادیبوں دانشوروں صحافیوں نے ایک بیان داغ دیا۔ پھر یوں ہوا کہ اتوار کی شام جب حلقہ کے جلسہ کے بعد بہت سے ادیب ٹی ہاؤس میں اکٹھے تھے تو ایک دانشور ایک بیان کا مسودہ لے کر ٹی ہاؤس میں داخل ہوا۔ دستور کے مطابق میز میز گیا' دستخط کرانے لگا۔ ایک میز پر یاروں نے سوال کھڑا کردیا کہ مولانا بھاشانی پر حملہ کی مذمت برحق مگر ہم جماعتی سیاست میں کیوں پھنسیں اور کسی جماعت کا نام لے کر کیوں مذمت کریں۔ آگے کیا ہوا۔ کالم (مورخہ 22 مارچ 1969ء) کی کہانی یوں سناتا ہے۔

''تب ایک ادیب نے مفاہمت کی صورت نکالی اور یہ تجویز پیش کی کہ کراچی کے ادیبوں کے اس بیان کو پڑھو جس میں ملکی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے تشدد کی بہر رنگ مذمت کی گئی ہے اور کچھ مطالبات کیے گئے ہیں۔ اعجاز حسین بٹالوی نے کہا کہ اس مقصد سے ادیبوں کا ایک جلسہ کرلو۔ میرزا ادیب بولے کہ جلسہ کے لیے گلڈ کا دفتر حاضر ہے۔ کسی نے کہا کہ قصہ زمین برسر زمین۔ ٹی ہاؤس ہی میں کیوں جمع نہیں ہوتے۔ عابد حسن منٹو نے انقلابی دانشوروں کو سمجھایا کہ بالکل بجا تجویز ہے۔

''اگلے دن شام کو احمد ندیم قاسمی کی صدارت میں کچھ ادیب' کچھ صحافی' کچھ رنگا رنگ داشور جمع ہوئے اور ایک بیان کے خاکے پر غور وفکر شروع ہوا۔ مگر ٹی ہاؤس کی ادیب پارٹی دو تین ہفتے پہلے اپنے رنگ کا ایک بیان جاری کر چکی تھی جس طرح ایک شاعر کو اپنی شاعری باقی سب شاعری سے افضل نظر آتی ہے اسی طرح اس پارٹی کو اپنا یہ بیان سب بیانوں سے افضل نظر آیا۔ واضح ہو کہ یہ وہی بیان ہے جس میں ادب اور کلچر کے احتساب کے لیے حکومت سے ایک ٹربیونل بنانے کی سفارش کی گئی تھی۔ قاسمی صاحب نے اس شق پر تو فوراً ہی خط تنسیخ پھیر دیا اور کہا کہ اب باقی بیان پر غور کر لو۔''

بہت بحث مباحثہ ہوا۔ آخر زیر بحث بیان کو فراموش کر کے ایک قرارداد منظور ہوئی جس میں ہر قسم کے تشدد' ہر رنگ کے سامراج' اور ہر طرز کی فسطائیت کی مذمت کرتے ہوئے مولانا بھاشانی پر حملہ کی مذمت کی گئی۔

اخباری بیانوں کے اس طوفان بے تمیزی سے ایک روز ناصر کاظمی جھنجھلایا۔ چائے پیتے بولا ''میں بھی ایک بیان جاری کرنا چاہتا ہوں۔''

''تم بھی؟''

''ہاں میں بھی۔ میں یہ بیان جاری کرنا چاہتا ہوں کہ آج میں اداس ہوں۔''

''یہ بیان تو نہیں چھپ سکتا۔''

''کیوں؟''

''اس میں خبریت نہیں ہے۔''

''مولانا بھاشانی پر حملہ کا واقعہ خبر بن سکتا ہے تو میرے اداس ہونے کا واقعہ کیوں خبر نہیں بن سکتا۔ کم از کم لاہور نامہ میں تو یہ بیان چھپ سکتا ہے۔''

اور اب میں اس زمانے میں جاری ہونے والے بیانات کو یاد کرتا ہوں۔ ان سارے بیانات کو جن پر معروف غیر معروف ادیبوں کے بے حساب دستخط ہوا کرتے تھے تو مجھے احساس ہو رہا ہے کہ بامعنی بیان تو یہی ایک تھا۔ ناصر کاظمی کا یہ بیان کہ آج میں اداس ہوں۔

◆◆◆

انقلاب کی سواری حلقہ ارباب ذوق تک تو آئی

شائستگی چو کتیکہ پیش مرداں می آید۔ بیان بازیاں' نعرے' گالم گلوچ' توتو میں میں' لپاڈگی' میرا ہاتھ تیرا گریبان' تیرا ہاتھ میرا گریبان' وقت کا دستور اب یہی تھا۔ وائی ایم سی اے کے سامنے سے گزرتے گزرتے میں ٹھٹکا۔ کتنے زمانے سے میں اس عمارت سے مانوس چلا آتا تھا۔ حلقہ ارباب ذوق کے جلسوں کی تقریب سے کیسے کیسے وضعدار بزرگ کو' ثقہ نقادوں کو' فقیر منش شاعروں افسانہ نگاروں کو' متین و سنجیدہ دانشوروں کو یہاں آتے جاتے دیکھا تھا' آج نیا منظر دیکھا' کیا دیکھا کہ بیچ سڑک پہ دو پارٹیاں لپاڈگی کر رہی ہیں' غصے میں بھرے نوجوان لپک لپک کر عمارت سے باہر آ رہے ہیں' نعرے لگاتے ہیں' پھر لپاڈگی کے مظاہرے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ پھر دیکھا کہ ظہیر کاشمیری نمودار ہوئے' ہاتھا پائی میں مصروف ہجوم کے بیچ جا کر دونوں ہاتھ بلند کیے اور با آواز بلند اپیل کرنی شروع کی۔ دوستو امن' امن۔

عجب ثم العجب۔ ایں چہ می بینم۔ پتا چلا کہ اندر انجمن شبان المسلمین کا جلسہ ہو رہا تھا' جہاں سی آر اسلم بھی تھے' میاں محمد طفیل محمد بھی۔ وہ سوشلسٹوں کی کمک کے ساتھ۔ یہ اسلام پسندوں کے لشکر جرار کی معیت میں۔ پہلے دونوں طرف سے نعرے لگنے شروع ہوئے' پھر توتکار' پھر بات گالم گلوچ تک پہنچی اور ہاتھ گریبانوں تک گئے۔

انجمن شبان المسلمین پر موقوف نہیں۔ جلسوں کا یہ نقشہ اب عام دیکھنے میں آتا تھا۔ جلسہ ہونا بھی ضروری نہیں تھا۔ شورش کاشمیری اور مولانا کوثر نیازی کی مڈھ بھیڑ کہیں ٹولنٹن مارکیٹ میں ہو گئی۔ پہلے آوازے کسے گئے۔ پھر گالیاں' پھر جوتی لات۔

ایسے موسم میں غلام عباس کراچی سے وارد ہوئے۔ نیا افسانہ بغل میں داب کر لائے۔ افسانہ حلقہ ارباب ذوق میں پڑھا۔ عنوان تھا ''دھنک'' ایک قسم کی فینتاسی

کچھ اس طرح کی کہ پاکستان سائنسی اعتبار سے ترقی کرتے کرتے اس مقام پر ہے کہ چاند پر آدمی اتارنے کا اہتمام کر رہا ہے۔ ہوٹل موہنجوداڑو میں دنیا کے ممالک کے نمائندے جمع ہیں اور اس سائنسی مہم کے نتیجہ کا انتظار کر رہے ہیں جو کامیاب ہوتی ہے' مگر ملاؤں نے اس مہم کو غیر اسلامی قرار دیا۔ تحریک چلائی' حکومت کو مستعفی ہونا پڑا' ملاؤں کی حکومت قائم ہو جاتی ہے' انجام کیا ہوا۔ برسوں بعد ایک منظر' پورا ملک صحرا بن چکا ہے' کچھ غیر ملکی سیاح اونٹوں پر یہاں پہنچتے ہیں' ہوٹل موہنجوداڑو کے آثار دریافت کرتے ہیں۔ پتا

چلتا ہے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں سے آدمی چاند پر بھیجا گیا تھا۔

افسانہ ختم ہوا۔ حلقہ میں قیامت اٹھ کھڑی ہوئی۔ آج کل حلقہ کے جلسوں میں اسلام پسند بھی دیکھے جاتے تھے۔ انہوں نے تو قیامت برپا کردی۔ ایک آواز اب تک کانوں میں گونج رہی ہے۔ اس شور میں یہ سب سے اونچی اور سب سے غصیلی آواز تھی۔ یہ آواز تھی عبدالقادر حسن کی۔ ہمیں فکر ہوئی کہ کہیں اسلام پسند عباس صاحب پہ نہ ٹوٹ پڑیں۔ بس یہ نوبت آیا ہی چاہتی تھی۔ چند دوست رضا کارانہ آگے بڑھے۔ عباس صاحب کو اپنے حلقہ میں لیا۔ بس ہم انہیں وہاں سے کسی طرح لے کر باہر سٹک لیے اور ٹی ہاؤس میں آ کر دم لیا۔

حلقہ میں اسلام پسندوں کی طاقت کا یہ آخری مظاہرہ تھا۔ اب حلقہ کے بیچ ایک نئی طاقت تیزی سے ابھر رہی تھی۔ ایک پستہ قد دانشور کتنے برسوں سے یہاں آ رہا تھا۔ بات ادب کی کم فلسفہ کی زیادہ کرتا تھا۔ جان ڈوئی کے حوالے کے بغیر نوالہ نہیں توڑتا تھا' مگر اب روپ دوسرا تھا۔ یاروں کے دیکھتے دیکھتے وہ ایک چھوٹا سا ماؤزے تنگ بن گیا۔ حلقہ میں اب تک ہم نے گرما گرم بحثیں سنی تھیں' مگر یہ انقلابی بحث سے گزرا۔ گفتگو فوراً ہی تقریر کا رنگ پکڑ لیتی' شدت جذبات سے جسم کانپنے لگتا۔ منہ سے پہلے انگارے برستے' پھر آواز بھرا جاتی اور رقت طاری ہو جاتی۔ اس طریقہ واردات نے بہت جلد اپنا کرشمہ دکھایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گرد شوق بغاوت رکھنے والے نوخیز دانشور اچھی خاصی تعداد میں اکٹھے ہو گئے اور اس طرح اکٹھے ہوئے کہ اپنے مرشد کے فدائی بن گئے۔ جہاں اس کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون بہانے کے لیے تیار۔ مرشد اپنے فدائیوں کے جلو میں حلقہ کے جلسہ میں نزول اجلال کرتا۔ فدائی کیل کانٹے سے لیس' انقلاب دشمنوں سے نبٹنے کے لیے مستعد' شست باندھ کر بیٹھ جاتے' جب کوئی نظم' کوئی غزل' کوئی افسانہ پیش کیا جاتا اور پیش کرنے والا اگر انقلاب کے اس پیغام سے بے بہرہ ہوتا جو ان دنوں حلقہ سے ٹی ہاؤس تک کی فضاؤں میں گونج رہا تھا تو پھر وہ ان فدائیوں کے نرغے میں آ جاتا۔ جب یہ فدائی تنقید کا ابتدائی فریضہ انجام دے چکتے تو پھر مرشد کی تنقید حرف آخر کے طور پر آتی۔ یہ ایک پورا خطبہ ہوتا کہ کس طرح سے ادب اب تک سامراج کے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال ہوا ہے اور کس طرح پاکستان کے ادیب اس وقت سامراج کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ رجعت پسند ادیب تو خیر ہوئے مگر ترقی پسند ادیب بھی اس کے حساب سے ترمیم پسند ہو چکے تھے اور روسی سامراج کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔

حلقہ میں بحث کا یہ نقشہ انور سجاد کی سیکرٹری شپ کے زمانے میں پوری طرح قائم ہوا اور پھر اس نے متوقع نتائج پیدا کیے۔ انور سجاد کا سیکرٹری بننا حلقہ کی تاریخ میں ایک موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد حلقہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے اور پھر کبھی وہ اپنی پچھلی

ڈگر پر واپس نہ آ سکا۔ اس عزیز کے سیکرٹری ہونے میں تو کوئی مضائقہ نہیں تھا' مگر خرابی اس باعث پیدا ہوئی کہ انور سجاد نے خالی اپنی ادبی حیثیت کی وجہ سے سیکرٹری کے الیکشن میں کامیابی حاصل نہیں کی تھی۔ اس سیاست زدہ عہد میں جب ہر ادارے اور ہر شعبہ میں نظریاتی تفرقہ پڑا ہوا تھا حلقہ میں انقلابیوں کی اس طاقت پکڑتی ٹولی نے حلقہ پر قبضہ کرنے اور اسے رجعت پسندوں اور انقلاب دشمنوں سے پاک کرنے کی ٹھانی۔ انہیں اس کام کے لیے ایک عدد ادیب کی ضرورت تھی' ایسا جوان کے فلسفہ میں ایمان رکھتا ہو۔ اور حلقہ میں اور حلقہ سے باہر ادیب کی حیثیت سے بھی پہچانا جاتا ہو۔ قرعہ فال انور سجاد کے نام نکلا۔

تو اب حلقہ میں فضا یہ تھی کہ ادب کا ذکر بھی تحقیر کے لہجہ میں کیا جاتا۔ دیسی ماؤزے تنگ نے جس کا نام عزیز الحق تھا' اپنے زور خطابت سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ شاعری اور افسانہ بنفسہ انقلاب دشمن سرگرمیاں ہیں اور ایسے وقت میں جب انقلاب کی جدوجہد اپنے فیصلہ کن مرحلہ میں ہو' کتابوں سے شغف کا مطلب ہے انقلاب کی جدوجہد سے فرار۔ تو اب حلقہ اور ٹی ہاؤس میں امنڈتے ہوئے نو خیز انقلابی ادیب بھی ایک احساس جرم کا شکار نظر آتے کہ انہوں نے کتابیں پڑھنے میں' شعر اور افسانہ لکھنے میں نئی لسانی تشکیلات اور وجودیت جیسے فلسفوں میں وقت ہی ضائع کیا۔ یہ وقت انقلاب کی جدوجہد میں صرف کیا جاتا تو اب تک پاکستان میں انقلاب آ چکا ہوتا۔

اس فضا میں جو شاعر جوافانہ نگار اپنی تازہ تخلیقی کاوش لے کر حلقہ میں پہنچا خوار و خستہ ہو کر واپس آیا۔ منیر نیازی نے اپنی باری آنے پر تھوڑی آنکھیں دکھائی تھیں۔

جب منیر نیازی اپنی نظم پڑھ چکا تو پہلے سعادت سعید نے پنی انقلابی تنقید کے جوہر دکھائے اور منیر نیازی کو ایک فراریت پسند انقلاب دشمن شاعر ثابت کیا۔ پھر اس فدائی نے جس جوش بغاوت میں اپنے والدین کے رکھے ہوئے نام کو رد کر کے اپنا نام لڈو رکھا تھا' منیر نیازی کی شاعری کو انقلاب کی کسوٹی پر کسا اور کھوٹا ثابت کیا۔

منیر نیازی نے غصیلی نظروں سے لڈو کو دیکھا اور کہا کہ لڈو میں تجھے ہڑپ کر جاؤں گا۔ مگر منیر نیازی کی یہ خوش فہمی تھی۔ یہ لڈو موتی چور کا نہیں تھا' بور کا تھا۔ اسے نگلا جا سکتا تھا نہ اگلا جا سکتا تھا۔

پھر جلسہ کے ختم کے بعد منیر نیازی نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور گرج کر کہا کہ وہ مگر وہ آدمی سعادت سعید کہاں ہے۔

مگر سعادت سعید نے عاقبت اندیشی دکھائی۔ اپنا محاکمہ دینے کے فوراً ہی حلقہ کے جلسہ سے سٹک لیا تھا۔

ویسے تو افتخار جالب بھی ان دنوں گرو بنے بیٹھے تھے ان کے گرد بھی چیلوں کا ہجوم تھا' مگر اب حلقہ ارباب ذوق میں عزیز الحق کے

سامنے ان کے چراغ کی لو مدھم رہتی تھی۔ بہرحال حلقہ سے باہر وہ خوب زور دکھا رہے تھے۔ چندے انہوں نے میرے کالم کی بھی رونق بڑھائی۔ جدید نفسیات کی کوئی بحث چل رہی تھی۔ اس میں دھم سے کود پڑے۔ پہلے تو یونگ کے پرستاروں کے لتے لیے اور سہیل احمد خاں سے بھڑ گئے۔ پھر یونگ کے ساتھ ساتھ انہوں نے کلاسیکی موسیقی کی بھی خبر لے ڈالی۔ جو خط انہوں نے میرے کالم کے نام بھیجا اس میں لکھا کہ۔

''ہمارے منیر احمد شیخ اور آپ کے حیات احمد خاں ہزار کوشش کریں۔ پہلے کی طرح آج بھی درباری دھری کی دھری رہ جائے گی۔ قوالی ہی چلے گی۔ کلاسیکی' ٹھیٹھ کلاسیکی موسیقی اپنے طبقاتی تناظر سے علیحدہ نہیں کی جاسکتی۔ کلاسیکی موسیقی کو زندہ کرنا درباروں اور راجوڑوں کو زندہ کرنا ہے۔ ان کے جانشینوں کو بقا بخشنا ہے۔ یہ کام طبقاتی سیاق کو فراموش کر کے ہی کیا جاسکتا ہے' از خود نہیں ہوسکتا۔''

حیات احمد خاں کہاں چوکنے والے تھے' فوراً ہی خط لکھا اور افتخار جالب کے استدلال کی چندی چندی کر دی۔

''نہ جانے افتخار صاحب نے درباری کے ختم ہونے اور قوالی کے جاری رہنے کی پیش گوئی کیسے کر دی۔ غالباً انہوں نے راگ درباری کو اس کے مروجہ نام کی وجہ گردن زدنی قرار دیا ہے۔ ان سے عرض کر دیجئے کہ درباری کا اصل اور پرانا نام کاہنڑہ ہے۔ میاں تان سین نے ایک دفعہ یہ راگ اکبر کے دربار میں گایا تھا اور اکبر نے خوش ہو کر اسے درباری کا لقب دیا تھا۔

''درباروں اور رجواڑوں کا زمانہ تو اب بیت چکا ہے۔ سلطانی جمہور کے زمانے میں آپ اس کا نام درباری رہنے دیں یا پھر اسے کاہنڑہ کر دیں' اس راگ کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اس راگ کی بنیاد بہت قدیم زمانے میں رکھی گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ آریاؤں کی آمد سے پہلے کاہنڑہ کے کسی قبیلے کا لوک گیت تھا۔ فنکاروں کی محنت سے یہ عوامی گیت کلاسیکی موسیقی کا حصہ بنا۔ آج یہ راگ بے شمار گیتوں' غزلوں اور گانوں کی بنیاد ہے' حتیٰ کہ قوال بھی اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے حسن و جمال پر عوام ہمیشہ سے فریفتہ رہے ہیں اور جب تک لوگ سنتے سناتے رہیں گے یہ راگ اپنی ٹھیٹھ کلاسیکل شکل میں زندہ رہے گا۔ میری کوشش سے نہ تو درباری اور نہ ہی کلاسیکی موسیقی فروغ پاسکتی ہے اور نہ ہی افتخار جالب صاحب کے تجزیے سے ختم ہوسکتی ہے۔ کلاسیکی موسیقی ملکہ موسیقی روشن آراء بیگم جیسے فنکاروں کے ریاض اور عوام کے ذوق و شوق کی وجہ سے زندہ رہے گی۔ موسیقی کانفرنس کے سالانہ جشن ہمارے فنکاروں کے کمال فن اور عوام کے ذوق و شوق کی زندہ شہادت ہیں۔

رہا قوالی کا معاملہ تو جالب صاحب اس حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ قوالی کا اصل مقام خانقاہ ہے۔ اگر افتخار جالب کی مراد بر آئی تو خانقاہوں کی رونق کے ساتھ قوالی کا بستر بوریا بھی گول ہو جائے گا۔

اور آپ نے یہ جو کہا ہے کہ میں جماعت اسلامی سے شاکی ہوں' یہ درست نہیں۔ مولانا مودودی ہمارے کالج میں دینیات کے استاد تھے۔ میں نے ان سے تعلیم حاصل کی ہے اور ان کے علم کا معترف ہوں۔ لیکن موسیقی مولانا کا مضمون نہیں۔ تھوڑے ہی عرصے کی بات ہے کہ مغربی پاکستان میں موسیقی کو دفنانے کا حکم ہوا تھا۔ یہ حکم اسلام کے نام پر جاری کیا گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ مولانا مودودی عالم دین ہیں' اس معاملہ میں ان کی رائے معلوم کی جائے۔

''چنانچہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے فرمایا کہ دف کے ساتھ گانا جائز ہے۔ میرے استفسار پر کہ اگر طبلے کے ساتھ گایا جائے تو اس صورت میں کیا احکام ہوں گے۔ مولانا نے کہا کہ طبلے کی سنگت میں گانا جائز نہیں۔ میں نے وضاحت چاہی تو انہوں نے فرمایا کہ دف ایک طرف سے بند اور دوسری طرف سے کھلی ہوتی ہے۔ طبلہ چونکہ دونوں طرف سے بند ہوتا ہے' اس لیے اس کے ساتھ گانا جائز نہیں۔

''اب آپ آتشیں شیشے سے مولانا کے اس استدلال اور افتخار جالب کے درباری قوالی اور طبقاتی تناظر والی بحث میں دلیل ڈھونڈنا شروع کریں تو آپ کا وہی حال ہوگا جو استاد امام دین کے کلام میں مطلب ڈھونڈنے والوں کا ہوا کرتا ہے۔

مخلص .....حیات احمد خاں

تو گویا حیات احمد خاں کو اس وقت دو محاذوں پر لڑنا پڑ رہا تھا۔ اسلام پسند تو پہلے ہی کلاسیکی موسیقی کو خلاف اسلام جان کر پاکستان سے نکال باہر کرنے پر تلے تھے۔ اب انقلابیوں کو راگ درباری سے دربار کی بو آنے لگی اور ساری کلاسیکی موسیقی انقلاب کی دشمن دکھائی دینے لگی۔ تو یک نہ شد دو شد۔ کلاسیکی موسیقی پاکستان میں دو پاٹوں کے بیچ میں آ گئی۔

ادھر یہ بحثیں چل رہی تھیں' ادھر مشرقی پاکستان میں حالات ابتر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان سے تناؤ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جنگ جیسے سر پہ کھڑی ہو۔ بھٹو صاحب کے دیئے ہوئے نعرے Confrontation with India نے جنگی بخار اور تیز کر دیا تھا۔ نئے انقلابیوں کو یہ نعرہ وارا کھاتا تھا۔ ہم خرما و ہم ثواب۔ چین سے وفاداری کا بھی حق ادا ہو رہا تھا اور حب الوطنی کے تقاضے بھی پورے ہو رہے تھے۔ لیجئے حلقہ ارباب ذوق کا ایک ہنگامہ خیز جلسہ یاد آ گیا۔ نخالص چینی انقلابی اور پیپلز پارٹی برانڈ والے انقلابی دونوں اکٹھے تھے اور آگ کے انگارے اگل رہے تھے۔ دیسی ماؤزے تنگ کے منہ سے کف جاری تھا اور جسم تھرا رہا تھا۔ مقدمہ یہ پیش تھا کہ بمبئی کے السٹریٹڈ ویکلی نے اپنا ایک پاکستان نمبر شائع کیا ہے۔ سازش' سازش' سازش۔ ارے یہ تو وہی پاک ہند کنفیڈریشن والا چکر ہے اور اس پرچہ میں پی ٹی وی کے آرٹسٹوں کو اتنا کیوں اچھالا گیا ہے۔ کس دھوم سے ان کی تصویریں شائع کی

گئی ہیں۔ پی ٹی وی کے سارے آرٹسٹ ایک دم سے مشکوک ہو گئے۔ ابھی ان پر لے دے ہو رہی تھی کہ کسی آفت کے پرکالہ نے توجہ دلائی کہ اس نمبر میں انتظار حسین کا بھی ایک افسانہ ترجمہ ہو کر چھپا ہے۔ دم کے دم میں توپوں کا رخ میری طرف ہو گیا۔ باقی مجرم تو غائب تھے ایک مجرم پکڑا گیا۔ شہزاد میرے برابر بیٹھا تھا۔ مجھے ٹہوکا ''یار چپکے کیوں بیٹھے ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟''

''کیا بولوں؟''

''اپنی صفائی پیش کرو۔''

''کیسی صفائی۔''

''کہو کہ انہوں نے اپنے طور پر یہ کہانی چھاپی ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

شہزاد نے میری ہمدردی ہی میں یہ بات کہی تھی' مگر اس کی منطق میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اگر السٹریٹڈ ویکلی کو میری ایک کہانی بھا گئی تھی اور قرۃ العین حیدر نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا تو اس میں میرے لیے خوش ہونے کا پہلو تو تھا۔ اپنی صفائی پیش کروں' یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پھر کہانی بھی اس نوعیت کی نہیں تھی کہ ہندوستان پاکستان سیاست کے پس منظر میں کسی کے لیے اس سے اپنے مطلب کے معنی نکالنے کی گنجائش ہو۔ یہ کہانی تھی ''ٹانگیں'' مگر یہ کمبخت نمبر بھی تو بہت غلط موقعہ پر آیا تھا۔ ابھی تو پیپلز پارٹی کے جیالوں نے خبردار کیا تھا کہ ہم ہندوستان کی ہاکی ٹیم کو لاہور میں میچ نہیں کھیلنے دیں گے۔ اوپر سے السٹریٹڈ ویکلی کا پاکستان نمبر دھم سے آ پڑا۔ خیر مگر آگے چل کر جب انقلابیوں کی کمان اتر گئی تو ایسی ساری ذمہ داریاں جماعت اسلامی والوں نے اپنے سر لے لیں۔

ملا کی دوڑ مسجد تک۔ ان دنوں ہماری مسجد شاکر علی کا گھر تھا۔ ٹی ہاؤس میں تو زیادہ وقت نہیں گزارا جا سکتا تھا۔ کہاں کی رباعی کہاں کی غزل۔ بلکہ اب تو نئی لسانی تشکیلات کی بحث بھی موقوف تھی۔ انقلاب کا وظیفہ پڑھا جا رہا تھا اور ہر ادیب چینی انقلابی اور بھٹو صاحب کا جیالا بنا نظر آتا تھا۔ میں اور زاہد ڈار یہاں سے نکلتے اور شاکر صاحب کی طرف ہو لیتے۔ شاکر صاحب بالعموم منہ لپیٹے پڑے نظر آتے۔ آدھے سوتے آدھے جاگتے۔ قدموں کی آہٹ پر کمبل سے منہ نکال کر دیکھتے۔ ''آ گئے۔'' اور پھر منہ لپیٹ لیتے اور فوراً ہی خراٹوں کی آواز آنے لگتی اور زاہد ڈار کو یکا یک یاد آتا کہ اس نے دوپہر کا کھانا تو کھایا ہی نہیں ہے۔ فخر الدین سے جا کر بات کرتا ''کچھ کھانے کو ہے۔''

''نہیں جی۔''

''انڈا تو ہوگا۔ آملیٹ بنالو۔''

''انڈا بھی نہیں ہے۔''

''پھر لے آؤ۔''

وہ شاکر صاحب کے قریب جاتا ''انڈا گھر میں نہیں ہے انڈا لے آؤں۔''

شاکر صاحب فوراً منہ کھولتے ''کیوں' کس لیے۔''

''ڈار صاحب آملیٹ کو کہہ رہے ہیں۔''

جھنجھلا کر زاہد ڈار کو دیکھتے ''یار تمہیں یہیں آ کر بھوک لگتی ہے' نہیں آئے گا انڈا۔'' اور فوراً منہ لپیٹ لیتے' مگر پھر اسی طرح منہ لپیٹے لپیٹے کہتے ''اچھا آج تو لے آؤ۔''

جب خوب اینڈ لیتے تب اٹھ کر بیٹھتے۔ فخر الدین سے چائے بنانے کو کہتے۔ پھر ہم سے مخاطب ہوتے ''ہاں یار کچھ سناؤ۔''

میں 1965ء کے ہنگامی دنوں کو یاد کرتا ہوں۔ ان دنوں میری شاکر صاحب سے ملاقات نہیں ہو رہی تھی۔ ایک دفعہ مڈھ بھیڑ ہوئی تو میں نے پوچھا ''شاکر صاحب آپ ان دنوں کیا کر رہے ہیں؟''

انہوں نے میرے لہجہ کو سونگھا اور فوراً اپنے اور میرے درمیان ایک شریفانہ فاصلہ پیدا کر کے بولے ''انتظار صاحب' میں تو ان دنوں رلکے پڑھتا رہتا ہوں اور چاند پینٹ کرتا ہوں جو سرحد کے اس طرف بھی چمکتا ہے وراس طرف بھی چمکتا ہے۔''

اس ہنگام مجھے ان کی اپنے اردگرد سے یہ بے تعلقی بھلی نہیں لگی تھی۔ مگر اب بھلی لگتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ ان دنوں وہ رلکے پڑھ رہے تھے (سرہانے ضرور رکھا رہتا تھا) ورنہ چاند پینٹ کر رہے تھے۔ جب بھی ان کے کمرے میں قدم رکھا' یہی دیکھا کہ لیٹے ہیں' آدھے سو رہے ہیں' آدھے جاگ رہے ہیں۔ جنگ کی بات کرتے تھے نہ سنتے تھے۔ ہاں ہر پھر کر اپنے بنگالی ہم عصروں کو یاد کرتے تھے۔ خاص طور پر زین العابدین کو ''یار پتا نہیں وہ لوگ کس حال میں ہوں گے۔''

شاکر صاحب ان دنوں تنہائی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ مطلب یہ کہ ان کی زندگی میں جو رونق آئی تھی وہ چار دن کی چاندنی نکلی۔ وہ جو ایک میم ان کی ہم سفر بنی تھی وہ انہیں چھوڑ کر جا چکی تھی۔ شاکر صاحب پھر اکیلے تھے۔ کہنے کو اس بھائیں بھائیں کرتے گھر میں دو افراد اور بھی تھے۔ ایک بوڑھا فخر الدین جو شاکر صاحب کے پکارنے پر صورت دکھاتا اور فوراً ہی واپس چلا جاتا۔ دوسرا سیزر تھا' جو کبھی بھونکتے نہیں دیکھا گیا۔ صرف دم ہلاتا تھا۔ آنے والے دوستوں کا دم ہلا کر استقبال کرتا' شاکر صاحب کے بیڈ روم تک ساتھ